جائنٹ اسٹاک کمپنیوں میں

سرمایہ کاری

صورتیں اور احکام

مصنف

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی

(بانی و مہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور)

شعبۂ تحقیق واشاعت

Jamia Islamia Maseehul Uloom, Bangalore

K.S. Halli, Post Kannur Village, Bidara Halli Hobli, Baglur Main Road, Bangalore - 562149

H.O # 84, Armstrong Road, Mohalla Baidwadi, Bharthi Nagar, Bangalore - 560 001

Mobile : 9916510036 / 9036701512 / 9036708149

فہرست جائنٹ اسٹاک کمپنیوں میں سرمایہ کاری، صورتیں اور احکام

جائنٹ اسٹاک کمپنیوں میں
سرمایہ کاری
صورتیں اور احکام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جائنٹ اسٹاک کمپنیوں میں سرمایہ کاری

صورتیں اور احکام

شیئرز (حصص) کے ذریعہ کمپنیوں میں سرمایہ کاری کے متعلق شرعی و فقہی طور پر جو سوالات ذہنوں میں پیدا ہوتے ہیں، ان کا حل علماءِ اسلام کی اہم ذمہ داری ہے، جس طرح دنیا میں رواج پانے والے دیگر نظاموں اور طریقوں اور نئے انکشافات اور جدید آلات کے متعلق ابھرنے والے سوالات کے جوابات اور حل ان کی ذمہ داری ہے۔

یہاں ہم جائنٹ اسٹاک کمپنی (Joint stock company) سے متعلق اہم سوالات کا شرعی و فقہی حل و جواب پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

شیئرز کے ذریعہ سرمایہ کاری کی شرعی حقیقت

سب سے پہلے اس سوال پر غور کرنا چاہئے کہ جب ایک شخص شیئر (share) کے ذریعہ کسی کمپنی میں سرمایہ کاری کرتا ہے تو اس معاملہ کی شرعی حقیقت کیا ہے؟ اور عقودِ شرعیہ میں یہ کونسا عقد ہے؟

کمپنی سرمایہ کاری کی دو صورتیں

اس کے جواب سے قبل یہ سمجھ لینا چاہئے کہ کسی کمپنی میں شیئرز کے ذریعہ سرمایہ کاری کی دو صورتیں ہیں:

ایک یہ کہ کمپنی ابھی وجود میں نہیں آئی بلکہ اس کے وجود میں لانے کے لیے اشتہار دیا گیا ہو، اور اس کے شیئرز حاصل کرنے کے لیے دعوت دی گئی ہو، اور جب چند افراد حصہ لیکر اپنا روپیہ اس میں لگائیں گے تو وہ کمپنی وجود میں آئے گی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ پہلے سے ایک کمپنی موجود ہے، اور اس کے مقررہ حصہ دار (share holders) ہیں۔ اور اس کمپنی میں شیئر حاصل کرنے کی صورت یہ ہے کہ پہلے سے اس کے جو حصہ دار ہیں ان میں سے کسی سے اس کا حصہ خرید لے اور وہ شخص اپنے حصہ سے اس کے حق میں دست بردار ہو جائے۔

پہلی صورت کا حکم

پہلی صورت میں سرمایہ کاری درحقیقت شرکت کا معاملہ ہے، کیونکہ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ دو چار آدمی مل کر کاروبار کرتے ہیں اور آپس میں نفع تقسیم کر لیتے ہیں یہاں بھی ابتداءً چند آدمی اپنا سرمایہ لگا کر کمپنی کو وجود میں لاتے ہیں اور اس کے ذریعہ کاروبار کرتے ہیں اور پھر نفع تقسیم کر لیتے ہیں، اس لئے یہ عقودِ شرعیہ میں سے عقدِ شرکت کے تحت داخل ہے۔

لیکن یہاں ایک اہم سوال یہ ہے کہ فقہاء کے نزدیک شرکت کی متعدد اقسام ہیں جن کا ذکر کتبِ فقہ میں بالتفصیل موجود ہے، تو یہ شرکت کی کونسی قسم ہے؟

شیئر، شرکت کی کونسی قسم ہے؟

فقہاءِ حنفیہ کے نزدیک عقدِ شرکت کی اولاً دو قسمیں ہیں، شرکتِ ملک اور شرکتِ عقد۔

(ا) شرکتِ ملک یہ ہے کہ دو یا زیادہ اشخاص اختیاراً یا اضطراراً کسی سامان کے مالک ہو جائیں۔

(۲) شرکتِ عقد یہ ہے کہ دو یا زیادہ اشخاص کسی کاروبار یا تجارت میں ایجاب وقبول کے ساتھ شریک وساجھی ہوجائیں۔

چنانچہ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

" الشركة ضربان، شركة أملاك وشركة عقود۔ فشركة الأملاك العين يرثها الرجلان أو يشتريانها .... والضرب الثاني العقود وركنها الايجاب والقبول الخ.(۱)

اور درمختار وشامی میں ہے:

وهى ضربان : شركة ملك وهى أن يملك متعدد (اثنان أو أكثر) عيناً أو ديناً الخ ۔ وشركة عقد أي واقعة بسبب العقد قابلة للوكالة وركنها أي ماهيتها الإيجاب والقبول. (۲)

اب غور طلب بات یہ ہے کہ کمپنی میں شرکت کس قسم میں داخل ہے؟ شرکت کی ان اقسام میں سے ظاہر ہے کہ شرکتِ ملک کی تعریف شیئرز کے ذریعہ کمپنی میں شرکت پر صادق نہیں آتی ،البتہ شرکتِ عقد کی تعریف اس پر صادق آتی ہے۔لہٰذا یہ شرکتِ عقد ہے۔

پھر شرکتِ عقد تین طرح پر ہے:

(۱) ایک شرکت بالمال کہ دو یا زیادہ افراد اپنا اپنا مال لگا کر کاروبار میں شریک ہوجائیں اور نفع تقسیم کرلیں۔

(۲) دوسری شرکت بالاعمال کہ دو یا چند لوگ کسی کام میں شریک ہوں جیسے ٹیلر، بڑھئی وغیرہ اور آپس میں یہ طے کرلیں کہ ہم سب ملکر کام کریں گے اور جو اجرت ملے تقسیم کرلیں گے۔

---

(۱) الھدایۃ:۶۲۴/۲ (۲) الدر المختار مع الشامی:۲۹۹/۴،ایضا۳۰۵/۴۔

(۳) تیسری شرکت بالوجوہ کہ اپنی وجاہت کی بنا پر دو یا چند افراد دوسروں سے مال تجارت لیکر کاروبار کریں اور نفع میں یہ سب شریک ہوجائیں۔(۱)

ان تین قسموں میں سے زیرِ بحث شرکت جیسا کہ ظاہر ہے پہلی قسم میں داخل ہے جس کو شرکت بالمال کہتے ہیں، کیونکہ اس میں ہر شریک اپنا مال لگاتا اور کاروبار کرتا ہے۔

شرکتِ مفاوضہ یا عنان؟

یہاں یہ بھی واضح ہوجانا چاہئے کہ شرکتِ عقد اپنی تینوں انواع کے ساتھ دو قسم پر ہے:

(۱) ایک شرکتِ مفاوضہ (۲) دوسرے شرکتِ عنان

اس طرح شرکتِ عقد کی مذکورہ تینوں قسمیں مفاوضہ وعنان کی طرف منقسم ہوکر کل چھ قسمیں ہوجاتی ہیں اور جیسا کہ عرض کیا گیا ہے زیر بحث صورت شرکت عقد کی پہلی قسم یعنی شرکت بالمال کے تحت آتی ہے اور جب شرکت بالمال کی دو قسمیں ہونگی تو زیرِ بحث صورت میں یہ سوال ہوگا کہ یہ کس صورت میں داخل ہے، شرکتِ مفاوضہ میں یا شرکتِ عنان میں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ شرکتِ عنان میں داخل ہے نہ کہ شرکتِ مفاوضہ میں، کیونکہ شرکتِ مفاوضہ کی جو تعریف کی گئی ہے، وہ یہاں صادق نہیں آتی۔

علماء نے شرکتِ مفاوضہ کی تعریف یہ کی ہے کہ:

" أما شركة المفاوضة فهو أن يشترك رجلان ويتساويا في مالهما

(۱) دیکھو البحر الرائق: ۲/۲۰۵، ہدایہ: ۲/۶۲۴، المبسوط للسرخسی: ۱۱/۱۵۱، درمختار مع شامی: ۴/۲۹۹

وتصرفهما ودينهما۔ (یعنی شرکت مفاوضہ یہ ہے کہ دو (یازیادہ) آدمی شریک ہوں اور دونوں (یاسب) مال میں، تصرف میں اور دین میں برابر ہوں)(۱)

لہٰذا کسی کا مال کم اور کسی کا زیادہ ہو تو مفاوضہ نہیں ہوسکتا، اسی طرح تصرف میں کمی بیشی ہو تو مفاوضہ نہیں ہوسکتا، اسی طرح دین دونوں کا ایک نہ ہو تو مفاوضہ نہیں ہوسکتا، اسی لئے لکھا ہے کہ شرکتِ مفاوضہ، کافر اور مسلم کے مابین نہیں ہوسکتی۔

امام محمدؒ الجامع الصغیر میں لکھتے ہیں:

" ولا تكون المفاوضة إلا بين حرين كبيرين مسلمين أو ذميين ولا تكون بين المسلم والذمي " (یعنی شرکتِ مفاوضہ صرف دو آزاد، بالغ مسلمانوں یا دو ذمیوں کے درمیان ہوسکتی ہے اور مسلم وذمی کافر کے درمیان نہیں ہوسکتی)۔(۲)

علامہ حصکفی درمختار میں فرماتے ہیں:

"فلا تصح مفاوضة وإن صحت عناناً بين حر وعبد ولو مكاتباً أو مأذوناً، وصبي وبالغ ومسلم وكافر لعدم المساواة .(۳)

ظاہر ہے کہ یہ تعریف اور اس کی یہ قیود، کمپنی کی شرکت پر درست نہیں بیٹھتے، اس لئے کہ کمپنی کا ہر شریک نہ مال میں برابر ہوتا ہے، نہ تصرف میں اور نہ دین وملت میں (کما ھو ظاھر)۔

اس لئے اب یہ متعین ہے کہ کمپنی کی شرکت، شرکتِ عنان ہے کیونکہ جہاں شرکتِ مفاوضہ بوجہِ فقدانِ شرط صحیح نہ ہوسکے اور وہ شرطِ مفقود، شرکتِ عنان میں مشروط نہ ہو تو وہ صورت شرکتِ عنان کی ہوتی ہے۔ درمختار میں ہے:

(۱) الھدایۃ:۲/۲۶۵، الجوھرۃ النیرۃ:۲/۱۴۶، وغیرہ (۲) الجامع الصغیر مع النافع الکبیر:۳۴۹
(۳) الدر المختار:۳/۳۰۶

"وكل موضع لم تصح المفاوضة لفقد شرطها ، ولا يشترط ذلك في العنان ، كان عناناً. (۱)

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے بھی کمپنی کے اس معاملہ کو شرکتِ عنان قرار دیا ہے۔ (۲)

ایک شبہ کا جواب

اوپر کی اس تفصیل سے واضح ہوا کہ یہ معاملہ شرکتِ عنان ہے مگر اس پر ایک شبہ واعتراض ہوتا ہے، وہ یہ کہ شرکتِ مفاوضہ وعنان دونوں میں یہ شرط ہے کہ راس المال، درہم، دینار یا رائج سکے ہوں۔

چنانچہ ہدایہ میں ہے: " ولا ينعقد الشركة إلا بالدراهم والدنانير والفلوس النافقة ". (۳)

درمختار میں ہے:" ولا تصح مفاوضة وعنان ذكر فيهما المال --- بغير النقدين والفلوس النافقة والتبر والنقرة إن جرى التعامل بهما. (۴)

مگر کمپنی میں بعض لوگ جو اس کو قائم کرتے ہیں پہلے سے کچھ سامان، عمارت وغیرہ کی شکل میں اپنا حصہ لگا چکے ہوتے ہیں پھر دوسرے لوگ روپیہ لگا کر حصہ خرید کرتے ہیں تو پہلے لوگوں کی طرف سے سکوں اور روپیوں سے شرکت نہ ہوئی تو یہ کس طرح صحیح و درست ہوگا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس مسئلہ میں ائمہ کرام کا اختلاف ہے، حنفیہ وشافعیہ و حنابلہ کا وہی مسلک ہے جو اوپر مذکور ہوا اور امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ ایک طرف

(۱) الدر المختار مع الشامی: ۳۰۷/۴ (۲) کمافی امداد الفتاوی: ۴۹۴/۳ (۳) ہدایہ: ۴۲۷/۲

(۴) درمختار مع شامی: ۳۱۰/۴

سے نقد روپیہ ہو، اور دوسری طرف سے کوئی سامانِ تجارت ہو یا دونوں طرف سے سامان ہوتو بھی شرکت کا معاملہ درست ہے۔

مشہور مالکی فقیہ علامہ ابوالبرکات الدردیر علیہ الرحمۃ الشرح الکبیر میں فرماتے ہیں:

"وتصح بهما أي بالذهب والفضة منهما ...... وبعين من جانب و بعرض من آخر وبعرضين من كل واحد". (۱)

" الفقه على المذاهب الاربعة "کے مصنف نے مالکیہ کا رأس المال کے سلسلہ میں مذہب نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: " ثانيها أن يكون رأس المال عيناً من أحدهما وعرض تجارة من الآخر كأن يدفع أحدهما نقداً من الذهب أو الفضة ويدفع الآخر سلعةً من قماش أو قطن أو قمح، ثالثها أن يكون رأس المال عرض تجارة من الشريكين الخ " (۲)

لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ معاملات میں حتی الامکان توسع ہوتا ہے، اس لئے اس مسئلہ میں ضرورت کی بنا پر امام مالکؒ کے مسلک کو اختیار کرتے ہوئے جواز کا فتوی دینے کی گنجائش ہے۔ البتہ مالکیہ کے نزدیک اس جواز کی شرط یہ ہے کہ سامان کی قیمت لگا کر شرکت کا اعتبار کیا جائے جیسا کہ الشرح الکبیر وغیرہ میں تصریح ہے:" واعتبر كل من العرض الواقع في الشركة من جانب أو جانبين بالقيمة ". (۳)

اور کمپنی کے کارکنان جو سامان وغیرہ کے ذریعہ شرکت کرتے ہیں وہ اس کی قیمت کے اعتبار سے ہی شریک ہوتے ہیں۔ اس لئے اس کے جواز کا حکم لگایا جا سکتا

(۱) الشرح الکبیر: ۳۴۹/۳ (۲) الفقہ علی المذاھب الاربعۃ: ۸۲/۳

نیز دیکھو: التاج والاکلیل: ۱۲۶/۵ (۳) الشرح الکبیر: ۹۴۳/۳

ہے۔حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے اس سوال وشبہ کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے:

''البتہ اس صورت میں کمپنی قائم کرنے والوں کی طرف سے شرکت بالنقفہ نہ ہوگی بلکہ بالعروض ہوگی ،سو بعض ائمہ کے نزدیک یہ صورت جائز ہے،'' فيجوز الشركة والمضاربة بالعروض يجعل قيمتها وقت العقد رأس المال عند أحمدؒ في رواية وهو قول مالكؒ وابن أبى ليلى'' (كما ذكره الموفق في المغني :٥/١٢٥)، پس ابتلاءِ عام کی وجہ سے اس مسئلہ میں دیگر ائمہ کے قول پر فتوی دیکر شرکتِ مذکورہ کے جواز کا فتوی دیا جاتا ہے۔(۱)

سرمایہ کاری کی دوسری صورت کا حکم

یہ سب تفصیل سرمایہ کاری کی اس صورت کے بارے میں تھی جس میں کمپنی کے قیام سے پہلے اس کو وجود میں لانے کے لئے سرمایہ کاری کی جاتی ہے۔

اب رہی دوسری صورت کہ کمپنی تو موجود ہے اور اس کے حصہ دار طے ہو چکے ہیں، اور اب کوئی شخص ایسی کمپنی کا شیئر حاصل کرنا چاہے تو اس کمپنی کے کسی شیئر ہولڈر سے اس کا شیئر خریدنا پڑے گا۔

اوپر عرض کیا گیا ہے کہ دراصل اس معاملہ کی حقیقت بیع یعنی خرید وفروخت ہے، تفصیل یہ ہے کہ کسی کمپنی کے شیئر ہولڈر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص اس کمپنی میں متناسب حصہ کی ملکیت رکھتا ہے، اب اس حصۂ ملکیت کو دوسرا آدمی اس سے لیتا ہے تو وہ دراصل اس سے اس حصہ کو خرید رہا ہے، اس لئے اس صورت پر بیع وشراء کے تمام احکامات لاگو ہوں گے۔

ہاں جب یہ شخص اس شیئر ہولڈر سے اس کا حصہ خرید لیگا تو وہ اس کی جگہ اس

(۱) امداد الفتاوی:۳/۴۹۱

کمپنی کا شیئر ہولڈر ہو جائے گا اور اس کا یہ معاملہ کمپنی سے وہی شرکتِ عقد کا ہوگا، جیسا کہ تفصیل سے اوپر عرض کیا گیا۔

اپنے حصہ پر مالکانہ تصرف؟

اب ایک سوال اس ضمن میں یہ رہ گیا کہ جب شیئر ہولڈر کمپنی میں ایک متناسب حصہ کی ملکیت رکھتا ہے تو اس کو تمام مالکانہ حقوق حاصل ہونا چاہئے مگر بظاہر اس کو کوئی مالکانہ تصرف کا اختیار نہیں ہوتا، تو اس سے اس مسئلہ پر کیا اثر پڑے گا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ شیئر ہولڈر کو بظاہر مالکانہ تصرف کا اختیار نہیں ہے لیکن حکماً وقانوناً یہ حق اس کو حاصل ہے، اسی لئے وہ اس حق کو فروخت کرسکتا ہے، اگر مالکانہ تصرف نہ حاصل ہوتا تو وہ اپنا حصہ دوسرے شخص کو کس طرح فروخت کرسکتا؟ ہاں وہ ہر قسم کا تصرف اس لئے نہیں کرسکتا کہ اس نے کارکنانِ کمپنی کو اپنا وکیل بنادیا ہے اور عقدِ شرکت میں شریک وحصہ دار کو اس کا حق ہے کہ وہ کسی کو اپنا وکیل بنادے۔

درمختار میں ہے کہ:

" ولكل من شريكي العنان والمفاوضة أن يستأجر من يتجر له أو يحفظ المال ويبضع أى يدفع المال بضاعةً بأن يشترط الربح لرب المال ويودع ويعير ويضارب؛ لأنها دون الشركة فتضمنتها و يؤكل أجنبياً ببيع و شراء". (۱)

صاحب بحرالرائق فرماتے ہیں:" ولكل من شريكي العنان والمفاوضة أن يبضع ويستأجر ويودع ويضارب ويؤكل ". (۲)

ان کا حاصل یہ ہے کہ شرکتِ مفاوضہ وشرکتِ عنان میں شریک لوگوں میں

(۱) الدرالمختار: ۳۱۶/۴-۳۱۷ (۲) البحر الرائق: ۱۷۷/۵

سے ہر ایک کو اس کی اجازت ہے کہ وہ کسی کو کسی کام پر مزدوری پر رکھے یا کسی کے پاس اپنا مال ودیعت رکھے یا کسی کو مضاربت کے لئے دے یا اپنا وکیل بنائے۔

ظاہر ہے کہ اگر مضاربت میں مال لگایا جائے گا اور مضاربت میں توقیت بھی جائز ہے،[1] تو اس مدت تک وہ مال مضارِب کے پاس ہوگا اور تصرف سے یہ شخص محروم ہوگا مگر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ تصرف کا اختیار نہیں رکھتا، بالکل اسی طرح یہاں سمجھنا چاہیئے کہ اس کو مالکانہ تصرف حاصل ہے مگر ایک عارض کی وجہ سے ظاہر نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

(۲) کمپنیوں کی قسمیں اور ان کے احکام

جائنٹ اسٹاک کمپنیاں بنیادی طور پر دو قسم کی ہیں، ایک وہ جن کا کاروبار حرام وناجائز ہے جیسے شراب بنانے کی کمپنی، سودی کاروبار کی بینک اور انشورنس کمپنی وغیرہ، دوسرے وہ جن کا کاروبار بنیادی طور پر حلال وجائز ہے. مثلاً ٹیکسٹائل کمپنی، آٹوموبائل کمپنی وغیرہ، اور اسی لحاظ سے ان کمپنیوں میں حصہ داری کے احکام بھی مختلف ہیں۔

حرام کمپنیوں میں سرمایہ کاری کا حکم

جہاں تک ان کمپنیوں میں سرمایہ کاری کا تعلق ہے، جن کا بنیادی کاروبار حرام وناجائز ہے، تو بالکل واضح وظاہر ہے کہ ایسی کمپنیوں میں سرمایہ کاری اور شرکت قطعاً حرام اور سخت معصیت ہے؛ کیونکہ شیئر خریدنے والا جیسا کہ اوپر عرض کرچکا ہوں، کمپنی کا برابر کا حصہ دار ہے، اسلئے کمپنی کا معصیت میں ابتلاء دراصل اس شیئر ہولڈر کا ابتلاء

(۱) کما فی الجوھرۃ: ۱۵۶/۲

وارتکاب ہے، اور پھر اس سے ہونے والی آمدنی بھی صریح حرام ہے۔ ایک تو اس کمپنی میں حصہ داری اور شرکت بذاتِ خود حرام وناجائز ہے، اور دوسرے اس سے حاصل ہونے والا نفع بھی حرام وناجائز ہے، اسلئے اس قسم کی کمپنیوں میں ہرگز شیئر ہولڈر نہ بننا چاہیئے۔

حلال کاروبار والی کمپنیوں میں سرمایہ کاری

اب رہی دوسری قسم کی کمپنیاں جن کا کاروبار حلال ہے، تو اس میں سرمایہ کاری اور شرکت کا حکم بھی واضح ہے کہ جائز ومباح ہے؛ کیونکہ مباح کام میں شرکت کی شریعت نے اجازت دی ہے، عقدِ شرکت کے جواز پر متعدد احادیث دلالت کرتی ہیں:

﴿ عن أبي هريرةؓ رفعه قال: إن الله تعالى يقول: أنا ثالث الشريكين مالم يخن أحدهما صاحبه ، فإذا خانه خرجت من بينهم ﴾(۱)

(حضرت ابو ہریرہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں دو شریکوں میں تیسرا ہوتا ہوں جب تک کہ ان میں سے کوئی اپنے ساتھی سے خیانت نہ کرے، پس اگر خیانت کرتا ہے تو میں ان کے درمیان سے نکل جاتا ہوں)۔

نصب الرایہ میں ہے کہ اس کو حاکم نے روایت کر کے صحیح قرار دیا ہے اور ابن القطان نے کہا کہ اس کی سند میں ابو حیان راوی ثقہ ہیں مگر ان کے والد جن سے یہ روایت کرتے ہیں وہ مجہول الحال والذات ہے۔(۲)

امام السرخسی نے لکھا ہے کہ شرکت کے جواز کی دلیل یہ ہے کہ حضرت سائب

(۱) ابوداؤد: ۲/۴۸۰ (۲) ملخصاً من نصب الرایہ: ۳/۴۷۴

بن شریک آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ کیا آپ مجھے پہچانتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہیں کیوں نہ پہچانوں، تم میرے شریک تھے اور بہترین شریک تھے، نہ تم نے معاملہ میں ظاہری مدارات کی اور نہ لڑائی بھڑائی کی۔(۱)

متعدد احادیث میں یہ واقعہ حضرت مجاھد کی روایت سے عبداللہ بن السائب کا بتایا گیا ہے، الامام المقدسی نے ''الاحادیث المختارۃ'' میں، امام الطبرانی نے ''المعجم'' میں اور ابوبکر الشیبانی نے ''الآحاد والمثانی'' میں اسی طرح روایت کیا ہے، نیز سائب بن ابی السائب سے بھی اسی طرح کا واقعہ سند سے نقل کیا گیا ہے۔(۲)

اور متعدد محدثین نے اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے کہ سائب بن ابی السائب حضور کی خدمت میں آئے تو صحابہ نے ان کی تعریف کرنی شروع کر دی، اس پر اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ میں ان کو تم سے بہتر جانتا ہوں، اس پر سائب نے عرض کیا کہ آپ سچ فرماتے ہیں، میرے ماں باپ آپ قربان ہوں، آپ میرے بہترین شریک تھے، نہ کبھی آپ نے کوئی چاپلوسی کی اور نہ جھگڑا کیا۔(۳)

اس روایت میں ان الفاظ ''آپ میرے بہترین شریک تھے، نہ کبھی آپ نے کوئی چاپلوسی کی اور نہ جھگڑا کیا'' کو سائب کی طرف منسوب کیا گیا ہے، جبکہ اوپر کی روایت میں انہی الفاظ کو حضور ﷺ کی جانب منسوب کیا گیا ہے، اسی لئے اس حدیث کو محدثین نے مضطرب ہونے کی وجہ سے ناقابل حجت قرار دیا ہے۔(۴)

یہ روایات اگرچہ سند کی حیثیت سے کچھ مضبوط نہیں ہیں، تاہم اس سے شرکت

(۱) المبسوط:۱۱/۱۵۱ (۲) الاحادیث المختارۃ:۹/۳۹۵ - ۳۹۷، معجم الاوسط۱/۲۶۸، الآحاد والمثانی:۲/۳۳، السنن للبیہقی:۶/۷۸ (۳) ابو داؤد: ۴۸۳۶، طبرانی کبیر:۷/۱۴۰، مسند احمد: ۱۵۵۳۹، الآحاد والمثانی:۲/۲۳ (۴) دیکھو نصب الرایۃ:۳/۴/۴۷

کا جواز مفہوم ہوتا ہے؛ کیونکہ اس کی تائید اجماع امت سے ہوتی ہے کہ تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ حلال کاروبار میں شرکتِ عقد جائز ہے۔اسلئے یہ زیر بحث صورت بھی ہر قسم کی بحث سے مستغنی ہے۔

سود میں ملوث کمپنیوں میں شرکت

البتہ یہاں ایک بات قابلِ لحاظ ہے، وہ یہ کہ حلال کاروبار کرنے والی کمپنیاں بھی دو قسم کی ہوسکتی ہیں، ایک وہ جن کا بنیادی کاروبار بھی حلال ہو اور از اول تا آخر ان کا طریقۂ کار بھی قواعدِ شرعیہ اور ضوابطِ فقہیہ کے عین مطابق ہو، مگر ایسی کمپنیوں کا وجود، ہندوستان بلکہ شاید دنیا میں کہیں بھی نہ ہو، الا ماشاء اللہ اور خصوصاً جو کمپنیاں بڑے پیمانے پر کاروبار کرتی ہیں، ان میں شاید ہی کوئی ایسی ہو جو تمام قواعدِ شرعیہ کا لحاظ کرتی ہو۔

دوسری وہ کمپنیاں ہیں جن کا بنیادی کاروبار اگر چہ حلال ہے مگر ان کے طریقِ کار میں بعض وقت اور بعض جگہ شرعی قواعد سے ہم آہنگی نہیں پائی جاتی، مثلاً وہ کمپنیاں کسی نہ کسی طرح سودی کاروبار میں ملوث ہوتی ہیں، کبھی تو اس طرح کہ اپنا راس المال بڑھانے کے لئے بینک سے سودی قرضہ لیتی ہیں، اور کبھی اس طرح کہ اپنا مال بینک میں رکھ کر سود حاصل کرتی ہیں، عام طور پر آج جو کمپنیاں قائم ہیں وہ اسی طرح کی ہیں کہ ان کا بنیادی کاروبار حلال ہے مگر سودی کاروبار کی ان دونوں شکلوں اور صورتوں میں وہ ضرور ملوث ہوتی ہیں، اب سوال یہ ہے کہ کیا ایسی کمپنیوں کے شیئرز خریدنا اور ان میں حصہ دار بننا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ مسئلہ دراصل ''تعاون علی الاثم'' کا مسئلہ ہے اور اس سلسلہ میں حضراتِ فقہاء کی عبارات بظاہر متضاد نظر آتی ہیں۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اپنے رسالہ " تفصیل الکلام فی مسئلة الاعانة علی الحرام" میں اس مسئلہ پر کافی اور سیر حاصل بحث فرمائی ہے، اور جو اس سلسلہ میں ضابطہ منقح

فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ:

''کسی معصیت کی اعانت جواز روئے قرآن حرام ہے، وہ وہ ہے جس میں معصیت کا قصد ونیت حقیقۃً یا حکماً شامل ہو، حقیقۃً یہ کہ دل ہی میں یہ ہو کہ اس کے ذریعہ سے عملِ معصیت کیا جائے، یا یہ کہ صلبِ عقد میں احد المتعاقدین کی طرف سے اس معصیت کی تصریح آ جائے۔ اور حکماً یہ کہ وہ چیز بجز معصیت کے کسی دوسرے کام میں آتی ہی نہ ہو، جیسے آلاتِ معازف، طبلہ، سارنگی اور مختلف قسم کے آلاتِ موسیقی۔ ان چیزوں کا بنانا اور بیچنا اگر چہ بقصدِ معصیت نہ ہو مگر حکماً وہ بھی قصدِ معصیت میں داخل ہے۔ اور جہاں قصدِ معصیت نہ حقیقتاً ہو نہ حکماً ہو وہ اعانت علی المعصیت نہیں، البتہ اس سے ملتی جلتی ایک اور چیز ہے جس کو تسبب کہتے ہیں اور وہ بھی از روئے قرآن حرام ہے''۔

اس کے بعد حضرت مفتی صاحبؒ نے تفصیل کے ساتھ سبب کے اقسام پر گفتگو کی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سبب دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک سببِ قریب اور ایک سببِ بعید۔ سببِ بعید کسی چیز کا، حرام نہیں، البتہ سببِ قریب حرام ہے مگر اس میں بھی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ سببِ قریب جالب اور باعث ہو گناہ کا کہ اگر یہ سبب نہ ہوتا تو صدورِ معصیت نہ ہوتا، یہ حرام ہے، اور اگر سببِ قریب گناہ کے لئے محرک وجالب نہ ہو جیسے کافر کو کرایہ پر گھر دینا جو اس میں شرکیہ کام کرے گا، ظاہر ہے کہ یہ مکان کرایہ پر دینا اس کے فعلِ شرک کا محرک نہیں، تو ایسے سبب کا حکم یہ ہے کہ اگر معصیت کا قصد ونیت کر کے یہ کام کرے گا تو یہ اعانت علی الحرام میں داخل ہو کر حرام ہوگا اور اگر قصد ونیت تو نہیں مگر یہ معلوم ہے کہ دوسرا شخص اس کو حرام کام میں لائے گا تو یہ سبب مکروہ ہے اور اگر علم نہیں تو مکروہ نہیں۔ (۱)

(۱) جواہر الفقہ: ۲/۴۴۲ تا ۴۵۵، نیز احکام القرآن عربی: ۳/۵۷ تا ۸۴

میں کہتا ہوں کہ اس تنقیح کے بعد اب غور طلب بات یہ ہے کہ زیر بحث کمپنی میں شرکت، اعانت علی الحرام کی کونسی صورت میں داخل ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ اعانت علی المعصیت کی پہلی تین صورتوں میں داخل نہیں ہے؛ کیونکہ شیئر خریدنے والے کا قصد وارادہ سودی کاروبار کا ہرگز نہیں ہوتا، دوسرے اس کا کوئی ذکر بھی صلبِ عقد میں نہیں ہوتا اور جو روپیہ وہ اس میں لگاتا ہے وہ معصیت کے لئے موضوع ومتعین نہیں۔ اس لئے اس قسم کی کمپنی میں شرکت کو اعانت علی الحرام نہیں کہا جاسکتا، **وھذا کله ظاھر**، ہاں یہ تسبب کی صورت میں داخل ہے مگر سببِ جالب میں نہیں، کیونکہ اس کمپنی میں شرکت مذکورہ معصیت کے لئے محرک نہیں ہے، بلکہ غیر جالب میں داخل ہے، اور غیر جالب کا حکم یہ بتایا گیا کہ اگر ''اعانت علی الحرام'' کی نیت وقصد اس میں شامل ہوتو حرام ہے ورنہ نہیں، اور عام طور پر یہاں ایسا نہیں ہوتا۔

لیکن عام طور پر چونکہ شریک کاروبار کو اس کا علم ہوتا ہے کہ یہ کمپنیاں سودی لین دین میں ملوث ہوتی ہیں، اس لئے اس قسم کی کمپنیوں میں شرکت مکروہ ہے، کیونکہ ''اعانت علی الحرام'' ہونے کا علم ہوتو سببِ قریب غیر جالب مکروہ ہے، اور میرے نزدیک مذکورہ کمپنیوں میں شیئر خریدنا اسی میں داخل ہے اور مکروہ ہے؛ کیونکہ عام طور پر شیئر خریدنے والے کو معلوم ہوتا ہے کہ کمپنیاں، اگرچہ بنیادی کاروبار حلال کرتی ہیں مگر ضمناً سودی لین دین میں ملوث ہوتی ہیں اور میرا شیئر وحصہ بھی اس میں لگتا ہے، جب یہ علم ہے تو مذکورہ قاعدہ کے مطابق یہ شرکت مکروہ ہوگی، اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس میں کسی بھی عالم کا اختلاف نہ ہوگا۔

البتہ یہ بات قابلِ بحث رہ جاتی ہے کہ شیئر خریدنے والا اگر کمپنی کے اندر سودی کاروبار کے خلاف آواز اٹھائے اور اس کاروبار کو بند کرنے کی اپیل کردے

تو کیا اس سے مذکورہ کراہت مرتفع ہو جائیگی اور کیا اس کے لئے ایسی کمپنی میں شیئر خریدنا جائز ہوگا؟

اس میں علماء کا عام رجحان یہی معلوم ہوتا ہے کہ شیئر ہولڈر کی اس آواز پر چونکہ موجودہ حالات میں کوئی کان نہیں دھرے گا اور اس کی یہ آواز، نقار خانے میں طوطی کی آواز سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی اس لئے اس کا اس کے خلاف آواز اٹھانا، بے سود اور کالعدم ہے۔لہٰذا اس سے کراہتِ مذکورہ مرتفع نہ ہوگی اور بعض علماء اس طرف گئے ہیں کہ اس کے خلاف آواز اٹھانے سے کراہت مرتفع ہوجائے گی اور اس معاملے کی نسبت اس کی طرف نہ ہوگی، چنانچہ حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے لکھا ہے کہ:

''جس حصہ دار کو حصہ داخل کرتے وقت اس کی سودی کاروبار کی اطلاع نہ ہو اس نے کارکنانِ کمپنی کو ان دوامر (سود لینے اور دینے) کا وکیل ہی نہیں بنایا، اس لئے کارکنوں کا یہ فعل اس کی طرف منسوب نہ ہوگا اور جن کو اطلاع ہو وہ تصریحاً اس سے ممانعت کردیں، گو اس ممانعت پر عمل نہ ہوگا، مگر اس ممانعت سے اس فعل کی طرف نسبت تو نہ ہوگی''۔(۱)

مولانا تقی عثمانی زید مجدہ نے ''فقہی مقالات'' میں اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی طرف بھی اس قول کو منسوب کیا ہے اور اپنا رجحان بھی اسی طرف ظاہر فرمایا ہے۔(۲)

اور یہ بات واضح ہے کہ جب اس نے بالتصریح اس معاملہ کی مخالفت کردی تو اس فعل کی نسبت اس سے قطعاً منقطع ہوگئی۔اس لئے راقم کے نزدیک بھی ایسی

---

(۱) امداد الفتاوی:۳/۴۹۱ (۲) فقہی مقالات:۱/۱۵۰

کمپنیوں میں مذکورہ شرط کے ساتھ حصہ لینے کی گنجائش ہے، ہاں نہ لینا احوط وانسب ہے۔ (واللہ اعلم)

مالِ مخلوط بالحرام کا حکم

مگر اس پر ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ کمپنیاں، سودی لین دین کریں گی تو ان میں دو طرح کا مال جمع ہوگا: ایک حلال مال جو اصل ہے، دوسرے یہ حرام مال، جو سودی لین دین کے نتیجہ میں حاصل ہوا ہے، تو یہ دو قسم کا مال ہے۔ سوال یہ ہے کہ اب جو بھی شخص اس کمپنی کے حلال کاروبار میں شرکت کرتا ہے اور اس کے شیئر خریدتا ہے اس کو بھی سودی روپیہ کا کچھ حصہ حاصل ہوگا، اور مال مختلط بالحلال والحرام کا مسئلہ پیدا ہوگا کہ اس کا کیا حکم ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ایسے مال کے متعلق حضراتِ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر غالب حلال ہے تو لے سکتا ہے اور اگر غالب مال حرام کا ہو تو اس کا لینا جائز نہیں۔

علامہ ابن نجیم المصریؒ نے فرمایا ہے کہ:

" إذا كان غالب مال المهدي حلالاً فلا بأس بقبول هديته وأكل ماله ما لم يتبين أنه من حرام ، وإن كان غالب ماله الحرام لا يقبلها ولا يأكل إلا إذا قال : إنه حلال ورثه أو استقرضه ". (۱)

اس سے معلوم ہوا کہ اگر غالب مال حلال ہو تو اس کا لینا جائز ہے، اور غالب مال حرام ہے تو جائز نہیں۔ اور امام غزالیؒ نے ''مالِ مخلوط بالحرام'' پر اپنی کتاب لاجواب ''احیاء العلوم'' میں بڑی تفصیل سے بحث کی ہے اور اس صورت کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ اس کے حکم میں مجھے اشتباہ ہے اور اگر مجھ سے اس کے بارے میں

(۱) الاشباہ والنظائر: ۳۴۳/۱۔ ۳۴۴

سوال ہوا تو میں نہیں جانتا کہ کیا کیا جائے۔(۱)

الغرض اس کو حرام تو نہیں کہا جا سکتا، البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سے بچنا ورع کی بات ہے، لیکن فتوی کے لحاظ سے اس کے لینے کی گنجائش ہے۔

سود کو صدقہ کر دے

مگر اس کے حساب میں جتنا سود آئے، اس کو صدقہ کر دینا ضروری ہے۔ مالِ مخلوط بالحرام کی بحث میں فقہاء نے جو لکھا ہے وہ اس صورت میں ہے کہ اس خلط کے نتیجہ میں حرام کی حلال سے تمیز نہ ہو سکے، اور زیرِ بحث صورت میں ....جیسا کہ ظاہر ہے........سودی لین دین کا حساب الگ ہو جاتا ہے اور بآسانی اس کو معلوم بھی کیا جا سکتا ہے، لہٰذا جو کچھ سود اس کے حصہ میں آیا ہے، اس کو صدقہ کر دینا چاہئے۔

مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہ نے اس سلسلہ میں صحیح لکھا ہے کہ:

''جب منافع تقسیم ہوں تو وہ شخص '' انکم اسٹیٹ منٹ'' ''Income Statement کے ذریعہ یہ معلوم کرے کہ آمدنی کا کتنا فیصد حصہ سودی ڈیپازٹ سے حاصل ہوا ہے، مثلاً فرض کیجئے کہ اس کمپنی کو کل آمدنی کا ۵رفیصد حصہ سودی ڈیپازٹ میں رقم رکھوانے سے حاصل ہوا ہے، تو اب وہ شخص اپنے نفع کا پانچ فیصد حصہ صدقہ کر دے۔(۲)

اور یہ اس لئے کہ مالِ حرام جس کا مالک معلوم نہ ہو، اس کا تصدق کرنا واجب ہے، خالص حرام کے بارے میں تو یہ واضح ہے، چنانچہ علامہ شامیؒ نے'' قنیہ'' کے حوالہ سے نقل کیا ہے:

" لوكان الخبيث نصاباً لا يلزمه الزكوة ، لأن الكل واجب

(۱) احیاء العلوم: ۱۲۲/۲ (۲) فقہی مقالات: ۱۵۰/۱

التصدق علیه ".

علامہ شامیؒ آگے کہتے ہیں:

" ویجب علیه تفریغ ذمته برده إلی أربابه إن علموا وإلا إلی الفقراء . (۱)

اور اگر مال، حرام وحلال سے مخلوط ہو جیسا کہ زیرِ بحث صورت میں ہے تو اس میں بھی بقدرِ حرام، تصدق واجب ہے، اسی لئے مخلوط مال کے بارے میں فقہاء نے لکھا ہے کہ صاحبِ مال اس کا ضامن ہوگا۔

"من ملك أموالًا غير طيبة أو غصب أموالًا و خلطها ملكها بالخلط ويصير ضامناً. (۲)

اس سے معلوم ہوا کہ مخلوط مال پر اگر چہ (امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک) ملکیت ثابت ہوجاتی ہے، مگر حرام مال کا وہ ضامن ہوتا ہے اور اس کو واپس کرنا اس پر لازم ہے۔

بلکہ علامہ شامی نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ اگر اس شخص کے پاس اس مال مخلوط کے سوا کوئی اور مال نصابِ زکاۃ کے برابر نہ ہو تو اس پر اس مال مخلوط کی زکاۃ بھی واجب نہیں، کیوں؟ اس کی وجہ تحریر کرتے ہیں کہ :" لأنه مديون و مال المديون لا ينعقد سبباً لوجوب الزكاة عندنا. (اس لئے کہ یہ شخص مدیون یعنی قرض دار ہے اور قرضدار کا مال ہمارے نزدیک وجوبِ زکاۃ کا سبب نہیں ہوتا) (۳)

مطلب یہ ہوا کہ یہ مال اس کا نہیں بلکہ ان کا حق ہے جن کا مال اس نے دبالیا ہے، اس لئے اس پر زکاۃ نہیں ہے بلکہ ان لوگوں تک اس کو پہنچانا لازم ہے۔

اسی طرح کمپنی سے حاصل ہونے والے نفع میں سے سودی رقم یا تو اس کے مالکان تک پہنچانا چاہئے یا فقراء پر صدقہ کر دینا چاہئے اور پہلی صورت مفقود ہے، اس

(۱) منحۃ الخالق علی البحر الرائق: ۲/۲۰۵ (۲) شامی: ۲/۲۹۱ (۳) شامی: ۲/۲۹۱

لئے تصدق لازم ومتعین ہے جیسا کہ اوپر علامہ شامیؒ کی عبارت سے معلوم ہو چکا کہ اگر اصحابِ اموال معلوم نہ ہوں تو فقراء کو دینا چاہئے۔

اس ضمن میں ایک ممکنہ سوال یہ بھی ہے کہ اگر اصل سرمایہ اور سودی رقم میں امتیاز کی کوئی صورت ممکن نہ ہو سکے تو ایسی صورت میں کیا کرنا چاہئے؟ میرے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ تخمینہ لگا کر غالب گمان کے مطابق سودی رقم صدقہ کردی جائے؛ کیونکہ بہت سے شرعی معاملات میں غلبۂ ظن کا اعتبار کیا گیا ہے، شامی نے لکھا ہے کہ:" لأن غلبة الظن من الأدلة الشرعية". (۱)

اور فقہاء نے یہ اصول بھی لکھا ہے کہ :" إن غلبة الظن معتبرة عند فقد الأدلة". (۲)

لہٰذا اس مجبوری کی صورت میں ایک اصل شرعی کے مطابق سودی رقم تخمینہ لگا کر صدقہ کردی جائے تو اس کی گنجائش ہونی چاہئے۔

(۳) ڈبنچر (Debenture) کے ذریعہ سرمایہ کاری

کمپنیوں میں سرمایہ کاری کا ایک طریقہ وہ ہے جس کو شیئر کہتے ہیں، اور اس کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کمپنی کے ڈبینچر (Debenture) خریدے جائیں۔

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ محض حصص کے ذریعہ سرمایہ کاری پر کمپنی کا چلانا بعض اوقات مشکل ہو جاتا ہے، اس لئے جب حصصِ تجارت ختم ہو جاتے ہیں تو کمپنی ''ڈبنچر'' کی پیشکش کرتی ہے، یعنی لوگوں سے سود پر قرض لیتی ہے، اس لئے ''ڈبنچرز'' دراصل حصص قرض ہیں جو خریدار کمپنی کو دیتا ہے اور اس کے عوض میں کمپنی اس کو سود

(۱) شامی: ۱/۲۸۷ (۲) بحر الرائق: ۸/۸۰

دیتی ہے،اور سود کے ساتھ نفع بھی دیتی ہے اور نقصان کی صورت میں رقم قرض کی واپسی کی ضمانت بھی دی جاتی ہے۔سوال یہ ہے کہ کیا کسی حلال کاروبار کرنے والی کمپنی کے ڈبینچر خرید کر،اس کے ذریعہ سرمایہ کاری کرنا جائز ہے یا نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ڈبینچر خریدنا جائز نہیں، کیونکہ یہ صریح اور براہِ راست سودی معاملہ ہے،اور کمپنی اگرچہ حلال کاروبار کرتی ہے مگر ڈبینچر خریدنے والے سے کمپنی کا جو معاملہ ہے،وہ حلال کاروبار سے متعلق نہیں ہے بلکہ سودی کاروبار سے متعلق ہے،جیسے ایک شخص کوئی حلال کاروبار کرتا ہے مگر ایک اور شخص سے سود پر قرض لیتا ہے،تو اس دوسرے شخص کو سود پر قرض دینا اور سود لینا جائز نہ ہوگا،اگرچہ جس کو قرض دے رہا ہے وہ حلال کاروبار کرتا ہے۔

نیز اس پر جو نفع کے نام سے دیا جاتا ہے وہ بھی درحقیقت سود ہی ہے،نفع نہیں ہے؛ کیونکہ یہ قرض پر نفع ہے اور قرض پر ملنے والا نفع سود ہے،حدیث میں ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ : " **کل قرض جر منفعته فهو ربا**" (۱)

اس حدیث پر محدثین نے کلام کیا ہے،اور اس کو ضعیف ٹھہرایا ہے؛ کیونکہ اس میں ایک راوی سوار بن مصعب متروک ہے،مگر اس کے باوجود اس کو بعض علماء نے صحیح یا حسن بھی کہا ہے،امام الحرمین نے اور ان کی اتباع میں امام غزالی نے اس کو صحیح کہا ہے۔(۲)

اور عزیزی نے کہا کہ : قال الشیخ : حدیث حسن لغیره.(۳)

---

(۱) مسند حارث بن ابی اسامة :۱/۵۰۰ (۲) خلاصة البدر المنیر لابن الملقن:۲/۷۸، التلخیص الحبیر :۳/۳۴ (۳) العزیزی:۳/۸۷

نیز اس کے بہت سے شواہدات ہیں، متعدد صحابہ سے یہ مضمون موقوفا وارد ہوا ہے، اس لئے یہ حسن لغیرہ ہے۔

الغرض اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قرض کی بنیاد پر حاصل ہونے والا نفع در حقیقت نفع نہیں بلکہ سود ہے، اس لئے ''ڈبنچر'' پر ملنے والا نفع، نفع نہیں بلکہ سود ہے، اسی لئے اس میں ضمانت دی جاتی ہے کہ نقصان کی صورت میں بھی قرض کی رقم واپس کی جائے گی، غرض یہ صورت سرمایہ کاری کی، قطعاً ناجائز ہے۔

ڈبنچر سے شیئر کی طرف

اسی ضمن میں ایک مسئلہ یہ بھی قابلِ بحث ہے کہ ڈبنچر (حصصِ قرض) کو حصصِ تجارت (شیئر) میں محول کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ عرض کیا گیا کمپنی اپنی ضرورت کی بنا پر ڈبنچر کی پیش کش کرتی ہے اور اس پر سود دیتی ہے، لیکن ڈبنچر بعد میں شیئر کی طرف منتقل کیا جاسکتا ہے اور ان حصصِ قرض کو کمپنی کی جانب سے ترجیح دی جاتی ہے، اس لئے ان کو {Preference Shares} کہا جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اس نیت سے'' ڈبنچر'' خریدنا جائز ہوگا کہ آئندہ اس کو شیئر میں تبدیل کرلیا جائے؟

ظاہر ہے کہ ڈبنچر کی حقیقت سودی قرض ہے، تو آئندہ اس کو حصصِ تجارت میں محول کرنے کے ارادہ سے خریدنا بھی ناجائز ہے، اور جب تک یہ شیئر میں منتقل نہ ہوجائے برابر گناہ ہوگا، اس لئے اس کا اس نیت سے خریدنا بھی جائز نہ ہوگا۔ ہاں کسی نے غلطی سے ڈبنچر خریدلیا ہے تو اس کو چاہئے کہ کوشش کرکے جلد سے جلد اس کو شیئر میں تبدیل کرلے، تاکہ گناہ سے بچ سکے۔ البتہ کوئی واقعی مجبوری ایسی ہو کہ'' ڈبنچر'' کا لینا اور خریدنا ناگزیر ہوجائے تو پھر فقہاء نے اضطرار وضرورت کی بحث میں جو لکھا ہے اس کے مطابق مشروط طور پر اس کی اجازت دی جاسکتی ہے، مگر مجبوری کی

وضاحت پیش کر کے حضرات علماء سے اس بارے میں فتوی لینا چاہئے کہ اس قسم کی مجبوری میں کیا اس کی اجازت ہوسکتی ہے؟ ظاہر ہے کہ جب تک مجبوری واضطرار کی شرح و وضاحت علماء کے سامنے نہ آئے، وہ اس پر کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے، لہذا اس صورت میں مبتلی بہ شخص اپنے حالات وکوائف علماء کے سامنے رکھ کر فتوی حاصل کرے۔

(۴) شیئر (Share) کی شرعی حیثیت

کمپنیوں کے شیئرز اور سنداتِ قرض جن کو بانڈز (Bonds) کہا جاتا ہے، ان کو بازارِ حصص (Stock Markets) میں خریدا اور بیچا جاتا ہے، ان کی بیع وشراء کا شرعی حکم معلوم کرنا اس پر موقوف ہے کہ خود ان شیئرز اور بانڈ کی شرعی حیثیت متعین کی جائے، اس لئے ہم ان کی شرعی حیثیت پر کلام کرتے ہیں۔

جہاں تک شیئرز کی حیثیت کا سوال ہے، تو اس میں دو احتمال ہیں: ایک یہ کہ شیئر (حصہ) کو محض ایک حق مانا جائے، دوسرا احتمال یہ ہے کہ شیئر کو مالِ متقوم قرار دیا جائے۔

کیا شیئر محض ایک حق ہے؟

جہاں تک پہلے احتمال کا تعلق ہے وہ صحیح نہیں معلوم ہوتا؛ کیونکہ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں ایک شخص جب شیئر خریدتا ہے تو درحقیقت وہ کمپنی میں ایک خاص حصہ کا مالک ہوتا ہے، اور ''شیئرز سرٹیفیکٹ'' جو اس کو حاصل ہوتا ہے وہ اس شخص کے متناسب حصہ کی ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ وہ ''متناسب حصہ'' محض ایک حق نہیں ہے جس کو فقہاء کرام ''حقوق مجردہ'' کے نام سے ذکر کرتے ہیں، بلکہ وہ ''مالِ متقوم'' ہے

نیز یہ اگر محض حق شرکت ہوتا تو تمام شیئر ہولڈروں سے ایک ہی مقدار میں رقم لی جاتی اور حق دیا جاتا، حالانکہ ایک شیئر ہولڈر اور دوسرے شیئر ہولڈر کے مابین ایک اور دس یا ایک اور بیس کا بھی فرق ہوتا ہے، مثلاً ایک شیئر ہولڈر ۱۰ ؍روپیہ کا ایک شیئر خریدتا ہے اور دوسرا دس یا بیس شیئرز خریدتا ہے، ظاہر ہے کہ زیادہ شیئر خرید نے والے کو نفع میں زیادتی تو حاصل ہوتی ہے مگر حقوق میں سے کوئی زائد حق اس کو حاصل نہیں ہوتا، اس سے بھی واضح ہے کہ شیئر محض حق نہیں ہے۔

لہٰذا دوسرا احتمال متعین ہوگیا کہ شیئر دراصل ''مالِ متقوم'' ہے اور اس کی ''سرٹیفیکٹ'' دراصل اس مال پر حاصل ''ملکیت'' کی نمائندگی کرتی ہے۔

بانڈ (Bond) کی حقیقت وحیثیت

اب رہا بانڈ کی حیثیت کا مسئلہ، تو وہ دراصل حصص قرض (ڈبنچر) کی سند وسرٹیفیکٹ ہے جو اس بات کی نمائندگی کرتی ہے کہ کمپنی کے ذمہ اتنا قرض ہے، اور قرض کا ''مال متقوم'' ہونا ظاہر ہے۔ البتہ بذاتِ خود بانڈ (سندِ حصصِ قرض) کی حیثیت قابلِ غور ہے، یہ تو ظاہر ہے کہ بانڈ جو کہ ایک کاغذ ہے، فی نفسہ اس کی کوئی حیثیت نہیں اور نہ یہ کاغذ کا پرزہ متقوم ہے، لیکن اس حیثیت سے کہ وہ حصصِ قرض کی سند ہے، عرفاً ایک خاص حیثیت کا حامل ہے، اور اس کی خرید وفروخت کا مطلب عرف میں اس کاغذ کی خرید وفروخت نہیں بلکہ اس مال کی خرید وفروخت ہے جس کی یہ سند ہے۔ خلاصہ یہ کہ بانڈز میں ایک تو اس پرزہ کے بجائے خود حیثیت کا سوال ہے تو یہ غیر متقوم شئ ہے۔ مگر اس اعتبار سے کہ وہ قرض کی سند ہے مالِ متقوم ہے، اور اسکی نظیر فقہاء کے کلام میں ملتی ہے۔

علامہ شامیؒ نے " صیرفیہ" کی یہ عبارت خطوطِ ائمہ کی بیع کی بحث میں ذکر کی ہے:

"سئل عن بيع الخط قال : لايجوز لأنه لايخلو إما أن باع ما فيه أو عين الخط، لاوجه للأول لأنه بيع ماليس عنده، ولا وجه للثاني لأن هذا القدر من الكاغذ ليس متقوماً بخلاف البراءة لأن هذه الكاغذة متقومة.(۱)

اس عبارت میں ایک کاغذ کے پرزے کو متقوم مانا ہے اور ایک کو غیر متقوم قرار دیا ہے۔ جہاں تک میں نے غور کیا، اسکی وجہ یہی معلوم ہوئی کہ امام کا خط جس میں وہ اپنے وظیفہ کو دوسرے کو دینے کی بات تحریر کرے، اس کی کوئی حیثیت نہیں اور اس کو درجہ سند کا نہیں۔ اس لئے فرمایا کہ "لان هذا القدر من الكاغذ ليس متقوما" اور براءت جو سلطان یا شاہی دفتر و دیوان کی طرف سے جاری ہوتی ہے، وہ چونکہ بے حیثیت کاغذ نہیں ہوتا، بلکہ اس کی عرفاً وقانوناً ایک حیثیت ہوتی ہے، اس لئے اس کاغذ کو متقوم قرار دیا۔

بالکل اسی طرح یہ ہوسکتا ہے کہ ایک چیز ایک حیثیت سے مال متقوم ہو اور وہی چیز دوسری حیثیت سے شئ غیر متقوم ہو، اس لئے بانڈ اس حیثیت سے کہ وہ ایک کاغذ کا پرزہ ہے، غیر متقوم شئ ہے، لیکن اس حیثیت سے کہ وہ ایک کمپنی کی جانب سے سند قرض ہے اور اس کی پشت پر ایک متقوم شئ ہے، وہ مال متقوم ہے۔

اس تحریر کے بعد مجھے اس سلسلہ میں مبسوط سرخسی میں ایک صریح جزئیہ مل گیا، جس سے چیک کا مال متقوم ہونا ثابت ہوتا ہے، امام سرخسی نے باب الاقرار میں ایک جزئیہ یہ لکھا ہے:

---

(۱) شامی: ۵۱۷/۴

" وإذا أقر الأجير إن ما في يده من تجارة أو مال لفلان وفي يده صكوك ومال عين فهو كله لفلان ؛ لأن ذلك كله من التجارة فإن ما في الصكوك وجب بسبب التجارة ،وهو مال من وجه باعتبار ماله فيتناوله عموم إقراره.(۱)

(اگر اجیر نے اقرار کیا کہ اس کے ہاتھ میں جو تجارت و مال ہے، وہ سب فلاں شخص کا ہے اور اس کے پاس کچھ چیکیں اور کچھ عین مال ہو، تو وہ سب اُس فلاں آدمی کا ہوگا؛ کیونکہ وہ سب تجارت میں سے ہے؛ کیونکہ چیکوں میں جو کچھ بھی لکھا ہوا ہے، وہ تجارت کے سبب سے واجب ہوا ہے اور وہ ایک اعتبار سے مال ہے، لہٰذا اس کے اقرار کے عموم میں یہ سب شامل ہوگا)

اس میں امام سرخسی نے چیکوں کو ایک اعتبار سے مال تسلیم کیا ہے اور اسی کی بنیاد پر اس شخص کے مال کے اقرار میں چیکوں کو بھی شامل کیا ہے۔ واللہ اعلم

انتباہ: یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ فقہاء نے'' براءتِ سلطانی'' کی بیع کو بھی ناجائز قرار دیا ہے، تو اس سے استدلال بے فائدہ ہے؛ کیونکہ یہاں اس وقت مقصود صرف یہ ہے کہ بانڈ کا مالِ متقوم ہونا ثابت کیا جائے، باقی اس کی بیع وشراء کے جواز وعدمِ جواز کو ثابت نہیں کرنا اس وقت پیشِ نظر نہیں ہے، اس کی بحث بعد میں آئے گی۔ دوسرے یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ براءتِ سلطانی کی بیع کا عدمِ جواز اس لئے نہیں کہ وہ غیر متقوم ہے، بلکہ اس کی وجہ دوسری ہے (کما سیاتی) غرض یہ کہ بانڈز (سندِ قرض) براءتِ سلطانی کی طرح ہمارے نزدیک شئ متقوم ہیں۔ (واللہ اعلم)

(۱) مبسوط السرخسی: ۱۸/۱۵۲

شیئرز کی خرید وفروخت

اب جبکہ واضح ہوگیا کہ شیئر دراصل ''شیئر ہولڈر'' کا ''ایک متناسب حصہ'' ہے جو اس کی ملکیت میں کمپنی سے اشتراک کے نتیجہ میں آیا ہے، اور وہ اس کا حقدار بھی ہے اور مالک بھی ہے، تو اس کی خرید وفروخت کا حکم بھی واضح ہے کہ جائز ودرست ہے، جیسے عام حالات میں ہر آدمی کو اپنی مملوک اشیاء اور مال پر تصرف کا اختیار رہے اور وہ ان کی بیع کرسکتا ہے، اسی طرح شیئر بھی اس کے دائرۂ تصرف واختیار میں ہے کہ چاہے تو دوسرے کو بیچ دے، اور اگر دوسرا شخص بیچے تو اس کو خریدا جاسکتا ہے، مگر اس سلسلہ میں شرعی قواعد واصول کی روشنی میں اس کے لئے چند شرائط ہیں، ان کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔ ان شرائط کی تفصیل یہ ہے۔

پہلی شرط: کمپنی حرام کاروبار نہ کرتی ہو

پہلی شرط یہ ہے کہ کمپنی حرام کاروبار نہ کرتی ہو۔ ہم نے اوپر جہاں کمپنیوں کی اقسام اور اس کے احکام بیان کئے ہیں، وہیں اس مسئلہ پر تفصیل سے کلام کردیا ہے کہ جن کمپنیوں کا کاروبار بنیادی طور پر حرام ہو، ان میں شرکت جائز نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ کمپنی کا شیئر، شیئر ہولڈر سے خریدا جائے گا تو شیئر ہولڈر اور اس کے خریدار کے مابین تو یہ معاملہ بیع وشراء کا ہے، مگر خریدنے کے بعد، اس خریدار اور کمپنی کے مابین شرکت کا معاملہ قائم ہوجائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ حرام کاروبار میں شرکت، صریح طور پر، ارتکابِ معصیت ہے، لہذا ایسی کمپنی کے شیئر خریدنے کی اجازت نہ ہوگی جو حرام کاروبار کرتی ہے۔

دوسری شرط: قیمت میں کمی بیشی نہ ہو

دوسری شرط یہ ہے کہ شیئر کی قیمت میں کمی بیشی نہ ہو، جتنے روپئے کا شیئر ہے

اتنے ہی میں خرید وفروخت ہو۔ مثلاً ۱۰/روپے کا شیئر ۱۰/ہی روپے میں خریدا یا بیچا جائے، ۱۱/یا ۹/روپے میں اس کی خرید وفروخت ناجائز ہے۔ وجہ بالکل واضح ہے کہ شیئر نوٹ کی طرح ہے، جس طرح ۱۰/روپے کا نوٹ ۱۰/ہی روپے میں فروخت کیا جاسکتا ہے، اس سے کم یا زیادہ میں نہیں، اسی طرح شیئر بھی اتنے ہی میں فروخت کیا جاسکتا ہے جتنے کا وہ ہے، ورنہ سود لازم آئے گا۔

قیمت میں کمی بیشی کے جواز کی صورت

البتہ ایک صورت ایسی ہے جس میں شیئر کو کمی بیشی کے ساتھ خریدا یا بیچا جاسکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ کمپنی نے شیئرز کے ذریعہ جمع ہونے والی رقم سے فکسڈ اثاثے {Fixed Assets} خرید لئے ہوں، مثلاً عمارت بنالی یا خرید لی، یا خام مال لے لیا یا کچھ فرنیچر خرید لیا، یا مشنری خرید لی، ایسی صورت میں اس کمپنی کا شیئر کمی بیشی کے ساتھ خریدنا یا بیچنا جائز ہے، اور اگر کمپنی کے پاس صرف سیال اثاثے (Liquid Assets) ہوں یا ابھی کمپنی کا کوئی قانونی وجود نہ ہو اور اسٹاک مارکیٹ میں اس کے شیئرز فروخت ہوتے ہوں، تو اس قسم کی کمپنی کے شیئرز کمی بیشی کے ساتھ فروخت کرنا جائز نہیں۔

اور جواز کی جو صورت عرض کی گئی، اس کی وجہ یہ ہے کہ روپے کے بدلے روپے لینے دینے کی صورت میں تو شرط ہے کہ دونوں طرف روپے برابر ہوں، کم یا زیادہ نہ ہوں، لیکن روپے کے بدلے اسباب واثاثہ دینے لینے کی صورت میں یہ شرط نہیں کہ جتنے کا سامان واثاثہ ہے، اتنے ہی میں فروخت کیا جائے، بلکہ اس میں کمی بیشی درست ہے۔ مثلاً ایک آدمی ۱۰/روپیہ میں کپڑا خریدا اور دوسرے کے ہاتھ ۲۰/روپیہ میں فروخت کیا تو بلاتامل جائز ہے۔

جب یہ واضح ہوا تو اب زیر بحث مسئلہ پر غور کیجئے کہ ایک شخص کے پاس کسی کمپنی کا ۱۰/روپے کا شیئر ہے، اور کمپنی نے اس میں سے ۸/روپے مختلف سامان واثاثے خریدنے میں خرچ کردیئے اور ۸/روپے نقد کے بجائے سامان واثاثے کی شکل میں تبدیل ہوگئے، اب یہ شخص اپنا وہ شیئر، دوسرے کو بیس ۲۰/روپیہ میں فروخت کردے تو جائز ہے، اور یوں کہا جائے گا کہ شیئر میں جو دو روپے نقد ہیں، اس کے بدلے دو روپے ہوگئے اور ۸/روپے کا جو سامان واثاثہ کمپنی میں ہے، اس کے بدلے ۱۸/روپے ہیں، یہ بالکل ایسا ہے جیسے فقہاء نے لکھا ہے کہ:

''تلوار کی مٹھی چاندی کی ہو اور اس کو مثلاً تین تولہ چاندی میں فروخت کیا جائے جبکہ مٹھی کی چاندی تین تولہ سے کم ہو، تو جائز ہے۔''

کیونکہ چاندی کے بدلہ چاندی کا دین لین ہو تو اس میں برابری شرط ہے، مگر چاندی کے بدلہ تلوار میں برابری شرط نہیں، لہٰذا یہاں یوں کہا جائے گا کہ دو تولہ چاندی کے بدلہ دو تولہ چاندی ہوگئی اور باقی ایک تولہ کے بدلہ تلوار ہے۔

فقہاء نے یہ جزئیہ لکھا ہے:

"من باع احد عشر درهما بعشرة دراهم ودينار جاز، وكانت العشرة بمثلها والدينار بدرهم. (۱)

یہ جزئیہ اور اوپر ذکر کردہ جزئیہ، زیرِ بحث مسئلہ کی فقہی نظیر ہے، لہٰذا ۱۰/روپے کے شیئر کو ۲۰/ میں یا اس سے کم وبیش میں فروخت کرنا اس صورت میں جائز ہوگا۔

مگر یہ بھی یاد رہے کہ اگر کسی وقت نقد رقم یا واجب الوصول قرضہ، شیئر کی اصل قیمت مثلاً ۱۰/روپے سے زیادہ ہوجائے یا اس کے برابر ہو، تو اس شیئر کو ۱۰/روپے

(۱) الجوهرة النيرة: ۵۹/۲، الهداية: ۵۹/۳

سے کم میں فروخت کرنا جائز نہ ہوگا۔ اگر چہ اس شیئر کی رقم سے اثاثہ بھی خرید کردہ موجود ہو۔ اس کی تفصیل وتشریح یہ ہے کہ ایک شخص نے ایک کمپنی کا شیئر ۱۰/روپے میں خریدا اور کمپنی ترقی کرتی رہی، کمپنی نے اس ۱۰/روپیہ سے مشنری خریدی، کچھ عمارت خرید لی، کچھ خام مال لے لیا اور کچھ نقد رقم باقی رہی، کاروبار کی ترقی سے خوب نفع ہوا اور یہ ۱۰/روپیہ کا شیئر کمپنی کی مالیت کے پیش نظر ۳۰/روپے کا ہوگیا اور اس ۳۰/میں سے ۲۰/تو مشنری ودیگر سامان میں لگے ہوئے ہیں اور ۱۰/روپے نقد کی شکل میں موجود ہیں، تو اب یہ شخص اپنا شیئر ۱۰/سے زیادہ میں تو بیچ سکتا ہے، لیکن ۱۰/سے کم میں نہیں بیچ سکتا؛ کیونکہ ۱۰/کی جگہ ۹/روپیہ میں شیئر کا بیچنا سود ہوجانے کی وجہ سے ناجائز ہے، اسی طرح کمپنی کا واجب الوصول قرضہ ہو اور اس شخص کی رقم سے مثلاً ۱۰/روپے اس قرضے میں لگے ہوئے ہوں، تو اب اس کو ۱۰/روپیہ سے کم میں اپنے شیئر کا فروخت کرنا جائز نہیں، اور وجہ وہی ہے جو اوپر عرض کی گئی۔

تیسری اور چوتھی شرط

جو کمپنیاں حلال کاروبار کرتی ہیں، لیکن ضمنی طور پر سودی لین دین میں بھی ملوث ہوتی ہیں، ایسی کمپنیوں کا شیئر خریدنا اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ:

(۱) اس سودی لین دین کے خلاف آواز اٹھائے۔

(۲) اور جو سودی رقم اس لین دین کے نتیجہ میں اس شخص کے حصہ میں آئے اس کو معلوم کرکے، بلانیتِ ثواب صدقہ کردے۔

ان دونوں شرائط کو ہم نے بڑی تفصیل سے اوپر پیش کردیا ہے۔ لہٰذا اعادہ کی ضرورت نہیں۔

قبضہ سے پہلے شیئرز کی بیع

یہاں تک کی اہم بحث کے بعد ایک اہم سوال زیر بحث ہے، وہ یہ کہ بسا اوقات شیئر کا خریدار شیئر خرید لیتا ہے، مگر شیئر اس کے نام پر منتقل نہیں ہوتا، یا یہ کہ اس کا اس پر قبضہ نہیں ہوتا، جس کو {Delivery} کہا جاتا ہے، اور اس ڈیلیوری سے قبل ہی کسی اور کو وہ فروخت کر دیتا ہے، اور آجکل اس طرح کا کاروبار اس قدر تیزی کے ساتھ جاری ہے کہ معلوم کر کے حیرانی ہوتی ہے۔ ایک شخص شیئر خریدتا ہے اور دنیا کے کسی بھی ملک کے کسی آدمی سے یہیں بیٹھے بیٹھے اپنا شیئر چند لمحوں میں فروخت کر دیتا ہے، اور اس سلسلہ میں انٹرنیٹ کا ایک خاص اور اہم رول ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ صورت شرعاً جائز ہے؟

اس سلسلہ میں شرعی اصول وضابطہ یہ ہے کہ جو چیز اپنے پاس نہ ہو، اس کی بیع جائز نہیں، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ :" **لا تبع ما ليس عندك**"(کہ جو چیز تیرے پاس نہ ہو اس کی بیع نہ کر)(۱)

لہٰذا جب تک کوئی چیز اپنے قبضہ میں نہ آجائے اس وقت تک اس کو کسی اور کو بیچنا جائز نہیں، البتہ یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ قبضہ کبھی تو حسی طور پر ہوتا ہے، اور کبھی حکمی طور پر، حسی قبضہ تو معلوم ہے، اور حکمی قبضہ یہ ہے کہ چیز اپنی ضمانت میں آجائے اور اس کے نفع ونقصان کی ذمہ داری اپنے اوپر آجائے۔

اس اصول کے بعد یہ دیکھئے کہ کمپنی کے شیئرز پر عام طور پر قبضۂ حسی نہیں ہوتا، بلکہ قبضۂ حکمی ہوتا ہے کہ شیئر خریدنے والے کے نام اس شیئر کی ضمانت و ذمہ داری آجاتی ہے، اس لئے شیئر کو آگے فروخت کرنے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ اس پر

---

(۱) ترمذی:۱۱۵۳، نسائی:۴۵۳۴، ابوداؤد:۳۰۴۰، احمد:۱۴۷۷۳

حکمی قبضہ ہو جائے۔ اگر شیئر خریدنے والا اس قدر قبضہ کا مالک ہو گیا تو اس کو حق ہے کہ وہ اپنے شیئرز کسی کو فروخت کر دے۔

لیکن اگر حسی اور حکمی کسی طرح کا بھی قبضہ نہ ہوا تو شیئرز کو فروخت کرنا جائز نہیں، اور آج انٹرنیٹ کے ذریعہ جو شیئرز کی خرید وفروخت ہو رہی ہے، وہ عموماً اسی قسم کی ہے کہ نہ وہ شیئر ضمانت میں آتا ہے اور نہ اس کے نام پر اس کی ڈیلیوری ہوتی ہے، مگر وہ کئی ہاتھ بدل چکا ہوتا ہے، یہ شرعاً کسی طرح جائز نہیں، اور صریح حدیث رسول کی خلاف ورزی ہے۔

دلال یا وکیل کی بیع کا حکم

یہاں ایک بات یہ جان لینا چاہئے کہ شیئرز کی خرید وفروخت ایک تو ان لوگوں کے مابین ہوتی ہے جو خود آپس میں لینا دینا چاہتے ہیں، ان میں سے ایک کو بائع (بیچنے والا) اور دوسرے کو مشتری (خریدنے والا) کہا جاتا ہے، لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خریدنے والے اور بیچنے والے کے درمیان کوئی تیسرا شخص دلالی کرتا ہے، اور یہ صورت کمپنیوں کے کاروبار میں بھی رائج ہے۔ اور اس کی بھی دو شکلیں ہیں: ایک یہ کہ خود کوئی کمپنی کسی کو اپنا وکیل ودلال مقرر کرتی ہے، جو کمپنی کے لئے کام کرتے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ کسی کمپنی کا شیئر ہولڈر کسی کو اپنا وکیل ودلال مقرر کرتا ہے۔

بہر صورت اس میں مسئلہ یہ ہے کہ وکیل ودلال کے ذریعہ خریدنے والا دراصل کمپنی یا اس شیئر ہولڈر سے خرید رہا ہے جس نے اس کو اپنا وکیل بنایا ہے، اس لئے کمپنی کے وکیل سے خریدنے والے کو یہ دیکھ لینا کافی ہے کہ کمپنی کا وجود بھی ہے یا نہیں؛ کیونکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کمپنی کا وجود ہی نہیں ہوتا اور اس کے شیئرز مارکیٹ میں فروخت ہونے شروع ہو جاتے ہیں، مگر اس میں وہی خرابی ہے جو ابھی ذکر کی گئی کہ جو

چیز موجود نہیں، اس کی بیع لازم آتی ہے۔ اس لئے اگر کمپنی کا وجود ہو اور اس کے شیئرز بکتے ہوں تو دلال کے ذریعہ خریدے جاسکتے ہیں اور یہ جائز ہوگا۔ اور اگر شیئر کسی شیئر ہولڈر کے وکیل سے خریدنا ہو تو یہ تحقیق کر لینا ضروری ہے کہ اس شیئر ہولڈر کے نام پر یہ شیئر ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو اس کے خریدنے کی اجازت ہوگی۔

شیئرز اور سٹہ بازی

شیئرز کی خرید وفروخت کے سلسلہ میں ایک اہم مسئلہ یہ زیر بحث آتا ہے کہ آجکل ''شیئرز مارکیٹ'' میں بعض لوگ محض کیپٹل گین کھیلنے کے مقصد سے شیئرز کی خرید وفروخت کرتے ہیں اور کاروبار میں شرکت کا کوئی ارادہ نہیں ہوتا، بلکہ ان کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ کم داموں پر بکنے والے کچھ شیئرز خرید کر دام کے بڑھ جانے پر فروخت کردیں گے اور اپنا روپیہ بنالیں گے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح اور اس مقصد کے تحت شیئرز کی خرید وفروخت جائز ہے یا نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ شکل اس صورت کے مشابہ ہے جس کو فقہاء کرام نے ''بیع العینة'' سے تعبیر کیا ہے اور اس کے جواز وعدم جواز کے بارے میں فقہاء کی رائیں مختلف ہیں۔

پہلے یہ سمجھئے کہ بیع العینہ کیا ہے؟ اس کی مختلف صورتیں بیان کی گئی ہیں، اور اس کی ایک معروف ومشہور صورت یہ ہے کہ کسی کو رقم کی ضرورت تھی اور اس نے کسی سے قرض مانگا، مگر اس نے اس خیال سے کہ قرض میں مجھے کوئی نفع نہیں ملے گا، اس لئے اس نے اس سے کہا کہ میں تجھے ایک کپڑا مثلاً ۵۰۰/روپئے میں دیتا ہوں جس کی قیمت بازار میں چارسو روپئے ہے، اور تو اس کو بازار میں چارسو پر فروخت کر کے اپنی ضرورت پوری کرلے، اور بعد میں میرے اس کپڑے کی قیمت پانچ سو ادا کردینا۔

اس صورت سے اس آدمی کو ۱۰۰ر روپئے نفع حاصل ہو گیا۔

امام شافعی اور امام ابو یوسف اس صورت کو جائز کہتے ہیں اور اکثر فقہاء کرام نے اس صورت کو حرام قرار دیا ہے، امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام احمد بن حنبل اور امام محمد رحمہم اللہ کا یہی مسلک ہے حتی کہ امام محمد نے اس کی بڑی مذمت فرمائی ہے اور فرمایا کہ یہ صورت سود خوروں نے ایجاد کی ہے۔ (۱)

اس لئے جمہور کے قول کے مطابق شیئرز خرید کرنے کی یہ صورت ناجائز ہے، بلکہ جیسا کہ امام محمد نے فرمایا سود کھانے کا ایک طریقہ و وسیلہ ہے، اس لئے یہ درست نہیں۔

شیئر کا رہن

شیئر کی خرید وفروخت کے مسئلہ کے بعد، اس کے رہن رکھنے کا مسئلہ بھی قابلِ غور ہے کہ کیا شیئر کو رہن رکھنا جائز ہے یا نہیں ہے؟ اس سلسلہ میں فقہاء کی ان تصریحات کو سامنے رکھا جانا چاہئے، ایک تو یہ کہ فقہاء نے مشاع چیز کے رہن کو نادرست قرار دیا ہے، چنانچہ یہ بات متعدد فقہی کتب میں ملے گی :لا یصح رهن المشاع. (۲)

اور الاشباہ میں ایک اصول کے طور پر یہ بتایا ہے کہ:

"ما قبل البيع قبل الرهن الا فى اربعة المشاع والمشغول والمتصل والمعلق عتقه بشرط قبل وجوده غير المدبر فيجوز بيعها لا رهنها". (۳)

(جو چیز بیع کو قبول کرتی ہے وہ رہن کو بھی قبول کرتی ہے، سوائے چار قسم کی

(۱) المبسوط: ۳۶/۱۴، شامی: ۲۷۳/۵، الموسوعۃ الفقہیۃ: ۹۶/۹ (۲) ہدایہ: ۵۰۸/۴ بحر الرائق: ۲۷۵/۸، مبسوط السرخسی: ۶۹/۲۱ (۳) الدر المختار مع الشامی: ۴۹۰/۶

چیزوں کے، ایک مشاع، دوسرے وہ چیز جو رہن رکھنے والے کے حق میں مشغول ہو، تیسرے وہ جو کسی اور چیز سے متصل ہو اور چوتھے وہ غلام جس کی آزادی کسی غیر موجود شرط پر معلق ہو، ان سب کی بیع تو جائز ہے، لیکن ان کا رہن رکھنا جائز نہیں)

اور یہ ظاہر ہے کہ کمپنی میں حصہ داروں کا بہت سا مال مشاع ہے۔ دوسرے یہ کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ شرکتِ عنان کا وہ شریک جو بیع وشراء کا معاملہ نہیں کرتا، اس کو رہن رکھنے کا حق نہیں، الفقہ علی المذاھب الاربعہ میں احناف کا مسلک بتاتے ہوئے لکھا ہے: " ومنها:انه ليس لشريك العنان الذى لم يباشرالبيع ان يرهن عينا من مال الشركة" (۱)

البتہ دیگر ائمہ امام شافعی وامام مالک وامام احمد رحمہم اللہ کے نزدیک شئ مشاع کا رھن رکھنا جائز ہے۔ (۲)

بانڈز کی خرید وفروخت:

بانڈز کی حیثیت جیسا کہ عرض کیا گیا، براءتِ سلطانی کے مانند ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کی خرید وفروخت کا کیا حکم ہے؟ فقہاء نے براءتِ سلطانی (شاہی پروانہ) اور ائمہ کے مقررہ حصے (حظوظِ ائمہ) کی بیع پر کلام کیا ہے، اور یہاں عبارات میں کچھ اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔

براءتِ سلطانی کے سلسلہ میں ''الاشباہ والنظائر'' میں ہے:" بيع البراء ات التى يكتبها الديوان للعمال لايصح" . اور درمختار میں ہے: "بيع البراء ات التى يكتبها الديوان على العمال لايصح بخلاف حظوظ الائمة " . اور بحر

(۱) الفقہ علی المذاھب الاربعہ: ۸۷/۳ (واللہ اعلم)

(۲) دیکھو: المحلی لابن حزم الظاھری: ۸۸/۸، بدایۃ المجتہد: ۲۰۵/۲

الرائق میں ہے کہ:" شراء البراء ات التی یکتبها الدیوان علی العمال لایصح بخلاف حظوظ الائمة". (۱)

ان عبارات میں براءتِ سلطانی کی بیع کا عدمِ جواز بیان کیا گیا ہے، اور اس کی وجہ فقہاء کرام نے یہ لکھی ہے کہ براءت میں لکھی ہوئی چیز چونکہ ابھی متعلقہ شخص کو حاصل نہیں ہوئی ہے، اس لئے یہ غیر مملوک شی کی بیع ہے جو جائز نہیں۔ (۲)

مگر ہم جس مسئلہ پر بحث کر رہے ہیں، اس میں عدمِ جواز کی علت پائی نہیں جاتی، کیونکہ جیسا کہ ظاہر ہے باونڈ سند قرض ہے اور یہ قرض کوئی معدوم چیز نہیں، لہٰذا اس کو براءتِ سلطانی کی بیع پر قیاس کر کے، اس کی بیع کو ناجائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اسی بات کی طرف ہم نے بانڈ کی حقیقت بیان کرتے ہوئے اشارہ کیا تھا۔

اور رہا مسئلہ حظوظِ ائمہ کا، تو شامیؒ نے لکھا ہے کہ حظوظ (مقررہ حصے) کی بیع کے سلسلہ میں "صیر فیہ" کے مؤلف سے پوچھا گیا تو فرمایا کہ جائز نہیں۔ (۳)

اور "اشباہ" "درمختار" "بحرالرائق" میں اس کی بیع کے جواز کی تصریح کی گئی ہے۔ (۴)

مگر یہ بھی ہمارے مسئلہ سے متعلق نہیں؛ کیونکہ مقررہ حصہ بیچنا الگ بات ہے۔ اور سند کا بیچنا الگ بات ہے۔ اسی لئے بعض کتابوں میں حظوظِ ائمہ کی جگہ خطوطِ ائمہ لکھا ہے اور خطوطِ ائمہ کی بیع کو ناجائز قرار دیا ہے۔ (۵)

ایک اور چیز ہے جس کو اس مسئلہ کی نظیر کہا جا سکتا ہے، وہ ہے جامکیہ کی بیع کا مسئلہ، جامکیہ وہ مقررہ حق یا حصہ ہے جو اوقاف کی جانب سے اصحاب وظائف کو ملتا

---

(۱) دیکھو: الاشباہ: ۲/۲۸۴، درمختار: ۴/۵۱۶، بحرالرائق: ۵/۲۸۰

(۲) الاشباہ: ۲/۲۸۵، البحرالرائق: ۵/۲۸۰، درمختار: ۴/۵۱۷ (۳) شامی: ۴/۵۱۶

(۴) الاشباہ: ۲/۲۸۵، درمختار مع الشامی: ۴/۵۱۶، بحرالرائق: ۵/۲۸۰ (۵) شامی: ۴/۵۱۷

ہے،اس کو بھی ناجائز قرار دیا ہے بایں وجہ کہ یہ "بيع الدين من غير من هو عليه" (دین کو اس شخص کے ہاتھ بیچنا جس پر دین نہیں) ہے،اور یہ جائز نہیں۔(۱)

اس سب کے علاوہ اس مسئلہ کی ایک واضح نظیر دور صحابہ میں بھی ملتی ہے، چنانچہ امام مسلم اور امام بیہقی وغیرہ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ:

﴿انه قال لمروان أحللت بيع الربا؟ فقال مروان: ما فعلت؟ أحللت بيع الصكاك وقد نهى رسول الله ﷺ عن بيع الطعام حتى يستوفى قال: فخطب مروان الناس فنهى عن بيعها ،قال سليمان: فنظرت الى حرس يأخذونها من أيدى الناس﴾(۲)

(حضرت ابو ہریرہؓ نے مروان بن الحکم سے فرمایا کہ کیا تم نے سود کو حلال کر دیا ہے؟ مروان نے کہا کہ میں نے کیا ایسا کام کر دیا؟ ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ تم نے چیکوں کی بیع کو حلال کر دیا جبکہ رسول اللہ ﷺ نے قبضہ سے پہلے کھانے کی بیع سے منع فرمایا ہے۔حدیث کے راوی حضرت سلیمان کہتے ہیں کہ پھر مروان نے لوگوں کو خطبہ دیا اور ان چیکوں کی بیع سے منع کیا۔سلیمان کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ پہرہ دار لوگوں کے ہاتھوں سے ان کو لے رہے تھے)

اور امام احمد اور امام مالک نے اپنی روایت میں یہ بھی بتایا ہے کہ مروان کے زمانے میں جب اس کا رواج ہوا تو لوگوں نے مروان سے ان کی بیع کی اجازت لی اور اس نے اجازت دیدی،تب حضرت ابو ہریرہ نے (اور مؤطا امام مالک میں یہ بھی ہے کہ حضرت زید بن ثابت اور ایک صحابی نے) اس پر مروان سے گفتگو کی۔(۳)

---

(۱) الاشباہ:۱۴/۴،شامی:۵۱۷/۴ (۲) مسلم:۱۵۲۸،سنن بیہقی:۳۱/۶،مسند ابی عوانہ:۲۸۳/۳

(۳) مسند احمد:۳۲۹/۲،مؤطا مالک:۲۶۴

اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ نے حدیث رسول سے استدلال کرتے ہوئے چیک کی بیع کو ناجائز قرار دیا ہے، اور مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت ابن عمر اور حضرت زید بن ثابت اور حضرت عامر سے بھی چیک کی بیع کا عدم جواز وارد ہوا ہے۔ (۱)

مگر اس مسئلہ میں اور صحابہ کے مذکورہ قول کی تشریح میں علماء کی دو رائیں ہیں، امام نووی نے شرح مسلم میں اسی حدیث کی شرح میں لکھا ہے:

" وقد اختلف العلماء فی ذلك والاصح عند اصحابنا و غیرهم جواز بیعها ، والثانی منعها اخذاً بظاهر قول ابی هریرة و حجته. (۲)

(اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے ، ہمارے اصحاب اور دیگر علماء کے نزدیک اصح اس کے بیع کا جواز ہے اور دوسرا قول حضرت ابو ہریرہ کے قول اور ان کی دلیل سے احتجاج کرتے ہوئے اس کی ممنوعیت کا ہے)

اس کے بعد امام نووی نے مجوزین کی طرف سے حضرت ابو ہریرہ کے قول و دلیل میں تاویل نقل کی ہے کہ یہ عدم جواز اس صورت میں ہے جبکہ چیک وصول کرنے سے قبل اس کی بیع کردی جائے اور اگر کوئی شخص چیک وصول کرنے کے بعد چیک کی بیع کرے تو یہ ناجائز نہیں ہے؛ کیونکہ یہ کاغذ اس شخص کی ملکیت میں ہے، اور صحابہ نے جو منع کیا ہے، وہ پہلی صورت سے منع فرمایا ہے۔ اور انہوں نے مؤطا کی روایت سے اس پر استدلال کیا ہے کیونکہ اس میں یہ ہے کہ:

"ان صکوکا خرجت للناس فی زمن مروان بطعام ،فتبایع الناس تلك الصكوك قبل أن یستوفوها(کہ لوگوں کی خاطر مروان کے زمانے میں کھانے کی چیکوں کا رواج ہوا اور لوگ ان کو وصول کرنے سے پہلے ہی ان کو بیچنے

(۱) دیکھو: مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۶۳/۴ (۲) شرح مسلم: ۶/۲

لگے) صحابہ نے اس صورت سے منع فرمایا تھا۔(۱)

یہ ساری شکلیں سامنے رکھنے کے بعد یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس کی بیشتر نظیروں میں فقہاء نے عدم جواز کا حکم کیا ہے اور صحابہ سے بھی بظاہر یہی ثابت ہے، اس لئے باونڈز کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے، اس لئے کہ یہ جا مکیہ کی طرح ''**بیع الدین من غیر من علیه الدین**''(دین کو اس شخص کے ہاتھ بیچنا جس پر دین نہیں) ہے، اور یہ جائز نہیں ہے۔ علامہ نووی نے اگرچہ صحابہ کے قول میں تاویل کی ہے مگر جمہور علماء اس کا ظاہری مطلب ہی لیتے ہیں۔

بانڈز کا رہن

اب رہا مسئلہ بانڈز کے رہن رکھنے کا، تو یہ درست ہے کیونکہ رہن کا مقصود، اعتماد ووثوق پیدا کرنا ہے۔ اور یہ بات یہاں حاصل ہوجاتی ہے، نیز رہن کی تعریف بھی اس پر صادق آتی ہے کہ رہن کسی شیٔ کو ایسے حق کے عوض محبوس کرنا ہے کہ اس حق کا وصول کرنا اس شیٔ سے ممکن ہو جیسے دیون ہیں۔

ھدایہ میں ہے کہ: " الرهن --- فی الشريعة جعل الشئ محبوساً بحق يمكن استيفائه من الرهن كالديون". (۲)

اور یہاں بانڈز بھی سندِ قرض ہیں، لہٰذا ان سے اس حق کا وصول کرنا ممکن ہے، لہٰذا یہ درست ہے۔ واللہ اعلم

حررہ العبد محمد شعیب اللہ خان

---

(۱) شرح مسلم: ۶/۲ (۲) ھدایہ: ۵۰۰/۴